مقدمہ

کلامِ غالبؔ کی تاریخی ترتیب کیوں

نصف صدی سے بھی کچھ پہلے کی بات ہے، مَیں کوئی دس گیارہ سال کا رہا ہوں گا۔ مادری زبان پنجابی ہونے کے باوجود گھر کے کونے کونے میں اُردو زبان چھائی ہوئی تھی۔ پورے پنجاب کا یہی حال تھا۔ میرے والدِ محترم اُردو کے ادیب تو نہ تھے، مگر انگریزی کے گریجویٹ ہوتے ہوئے بھی اُردو فارسی کے اس حد تک رسیا تھے کہ اُنھیں اِن زبانوں کا عالم کہنا کچھ زیادہ غلط نہ ہوگا۔ مدرسے کے بعد گلستاں، بوستاں اور انوارِ سہیلی کے اسباق مَیں اُنھی سے لیا کرتا تھا۔

ہمارے یہاں ادبی کتابوں میں آبِ حیات (آزاد) اور یادگارِ غالبؔ (حالی) سامنے ہی دھری رہتی تھیں۔ مَیں نے اِنھیں نہایت رغبت سے پڑھا، آبِ حیات پوری اور 'یادگارِ غالبؔ' کا سوانحی حصّہ۔ قصّے کہانیاں سمجھ کر اِن سے بہت حظ اُٹھایا۔ اُنھی ایّام میں ایک چھوٹی سی کتاب 'یوسفِ ہندی قیدِ فرنگ میں' نئی نئی آئی تھی۔ چوری چھپے پڑھی۔ مواد ثقیل تھا اور فارسی اشعار بہت تھے۔ کچھ پلّے نہ پڑا۔ گھر میں ہر سال ہمارا خاندانی بھاٹ راجستھان سے آیا کرتا تھا۔ پرانے تاریخی اور فی البدیہہ

کبت بہت اچھے کہا کرتا تھا۔ محرّم میں تعزیہ اُٹھتا تھا۔ نوحہ خوانی ہوتی تھی۔ بعض نوحے دل کو چھو لیتے تھے۔ سب پر مستزاد یہ ادبی کتابیں خاص کر 'آبِ حیات'۔ مجھے شعر کہنے کی چاٹ لگ گئی جس سے آج اٹھاون سال گزر جانے پر بھی سیری نہیں ہوئی۔ ناسخ کیا اچھا کہہ گیا ہے۔ ؎

یہ لگی چاٹ مرے زخموں کو سیری نہ ہوئی
ہو گئے کتنے ہی قاتل کے نمک داں خالی

جنوری ۱۹۷۰ء میں کینیا مشرقی افریقہ سے ہندوستان لوٹا اور بمبئی میں مستقل سکونت اختیار کی۔ شاعری سے والہانہ وابستگی تو تھی ہی، تھوڑا سا رُخ تحقیقِ ادب کی طرف بھی پھر گیا اور یہی آخر کو ٹھہرا فن ہمارا۔

اس مشغلے کے لیے ذاتی کتب خانے کی ضرورت لاحق ہوئی۔ ایک دن کتابوں کی نئی خرید کے ڈھیر میں سے ایک کتاب "یوسفِ ہندی قیدِ فرنگ میں" نکل آئی۔ محسن بن شبّیر کی لکھی ہوئی اور ربیع الثانی ۱۳۵۱ھ میں حیدرآباد کی چھپی ہوئی۔ یہ وہی ایڈیشن تھا جس کا اٹھاون سال پہلے میں نے مطالعہ کرنے کی ناکام کوشش کی تھی۔ اب کے اسے ایک ہی نشست میں پڑھ ڈالا اور غور کرنے پر معلوم ہوا کہ شاعر کے کسی شعر کو سامنے رکھ کر قصّہ گھڑ لینے کی جو روِش ہمارے پُرانے تذکرہ نویسوں اور سوانح نگاروں نے اختیار کر رکھی تھی وہ آج بھی جاری ہے جیسے کہ محسن بن شبّیر لکھتے ہیں۔ (ص ۱۵)

"رفعِ اذکار کے لیے ان [غالب] کو بھی تفریحِ طبع کا کچھ سامان کرنا ضرور تھا۔ دو حرفی [مے] کا استعمال بھی وہ غم غلط کرنے کے لیے کیا کرتے تھے جیسا کہ وہ خود فرماتے ہیں۔

مے سے غرض نشاط ہے کس روسیاہ کو
اک گونہ بے خودی مجھے دن رات چاہیے"

یہ شعر نسخۂ شیرانی (۱۸۲۶ء) کے متن میں موجود ہے۔ ظاہر ہے کہ اسی سال یا اس سے کچھ

پہلے کہا گیا ہوگا۔ اس وقت مرزا پورے شباب پر تھے، کیا بلحاظِ عمر اور کیا بہ اعتبارِ شاعری، لہٰذا اس شعر سے غم غلط کرنے کا مطلب ہرگز نہیں نکلتا۔ نسخۂ شیرانی میں اس غزل کے دس شعر ہیں، ہر شعر سے رنگِ تغزّل اُمڈا پڑتا ہے۔ دُور دُور تک آلام و افکار کا پتا نہیں۔ یوں بھی یہ مرزا بیدل کے اس شعر کا ترجمہ سا معلوم ہوتا ہے ؎

مطلبم از مے پرستی تر دماغی ہا نہ بود
یک دو ساغر آب دادم گریۂ مستانہ را[1]

پھر (ص ۴۰) لکھتے ہیں:

"ایک مرتبہ قرض خواہوں نے نالش کی جواب دہی میں طلب ہوئے۔ مفتی صدرالدّین آزردہ کی عدالت تھی۔ جس وقت پیشی میں گئے، یہ شعر پڑھا ؎

قرض کی پیتے تھے مے، لیکن سمجھتے تھے کہ ہاں
رنگ لائے گی ہماری فاقہ مستی ایک دن"

آزردہ[2] ۱۵ جون ۱۸۴۴ء کو صدر الصدور مقرر ہوئے تھے۔ اس سے پہلے (شاید ۱۸۲۷ء سے) صدر امین تھے۔ صدر امین کو اب امین کہتے ہیں اس کی اپنی عدالت نہیں ہوتی لیکن شعر نسخۂ بھوپال (حمیدیہ۔ ۱۸۲۱ء) کے متن میں موجود ہے۔ اس وقت غالب ۲۳-۲۴ سال سے زیادہ کے نہ تھے۔ واقعہ کچھ اس طرح بیان کیا گیا ہے جیسے شعر بھری عدالت میں فی البدیہہ پڑھا گیا ہو۔ اس بات کا قوی امکان ہے کہ شعر کو

---

[1] معلوم ہوتا ہے بیدل نے بھی یہ مضمون خیام کی رباعی ہی سے اُڑایا ہے ؎

مے خوردنِ من نہ از برائے طرب است ؛ نے بہرِ فساد و ترکِ دین و ادب است
خواہم کہ بے خودی برآرم نفسے ؛ مے خوردن و مست بودنم زیں سبب است

[2] مفتی صدرالدین آزردہ از پروازِ اصلاحی ص ۲۱

سامنے رکھ کر قصہ گھڑ لیا گیا ہے۔ نالش کا واقعہ بھی اس شعر کی تخلیق سے کم از کم ۱۶ سال بعد کا ہے۔ آہنگِ غالب[1] میں درج ہے۔

"جامِ جہاں نما کی ۷ جون ۱۸۳۷ء کی اشاعت میں یہ خبر شائع ہوئی تھی کہ میکفرسن صاحب نے جو ایک انگریز شراب فروش تھا، مرزا غالب کے خلاف دعوے دائر کر کے ڈھائی سو روپے کی ڈگری حاصل کر لی۔ جب وہ کسی سے ملنے جا رہے تھے تو عدالت کے چپراسی نے انھیں گرفتار کر لیا اور تھانے میں لے گیا۔ اتفاق سے اس وقت نواب امین الدین خاں کو اس کی اطلاع ہو گئی تو انھوں نے فوراً چار سو روپے مع اصل ادا کر کے غالب کو حوالات سے نکلوایا۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔"

ص ۵۳ پر حالی کے حوالے سے لکھتے ہیں:

"کپڑا اور تمام ضروریات ان کو گھر سے پہنچتی تھیں"

یہاں حالی نے سچ کو چھپایا ہے۔ غالب خود اس بات کی نفی کرتے ہیں ؎

شادم از بندکہ از بندِ معاش آزادم
از کفِ شحنہ رسد جامہ و نانم در بند

یعنی میں اس قید سے خوش ہوں کیونکہ اس نے مجھے قیدِ معاش سے بری کر رکھا ہے۔ اب مجھے روٹی کپڑا داروغۂ جیل پہنچاتا ہے۔ آزاد کے حوالے سے لکھتے ہیں۔ (ص ۵۴)

"جس دن [غالب] وہاں [قید خانے] سے نکلنے لگے اور لباس تبدیل کرنے کا موقع آیا تو کرتا وہیں پھاڑ کر پھینکا اور یہ شعر پڑھا:

ہائے اس چار گرہ کپڑے کی قسمت غالب
جس کی قسمت میں ہو عاشق کا گریباں ہونا"

اس اقتباس کا پہلا حصہ بھی درست نہیں ہو سکتا کیوں کہ جیل خانے کے کپڑے واپس کرنے پڑتے ہیں، پھاڑ کر پھینکے نہیں جا سکتے اور شعر والا حصہ تو نرا افسانہ ہے کیونکہ

[1] آہنگِ غالب (اشاعت دوم) ستمبر ۱۹۷۱ء ص ۸۷

یہ شعر بھی ۱۸۲۱ء یا اس سے پہلے کا کہا ہوا ہے جبکہ اسیری کا حادثہ مئی ۱۸۴۷ء میں پیش آیا اور جیل سے رہائی غالباً اگست ۱۸۴۷ء میں ہوئی۔ ظاہر ہے کہ شعر فی البدیہہ نہیں کہا گیا تھا۔ زیادہ سے زیادہ موقع دیکھ کر پڑھ دیا گیا ہوگا مگر شعر واقعے کے لحاظ سے بھی ایسا باموقع نہیں۔ اسے خواہ مخواہ میں اس حادثے سے جوڑ دیا گیا ہے۔ یہ غزل مرزا کی بہترین غزلوں میں سے ہے۔

جلسۂ غالب[1] میں ڈاکٹر سید رغیب حسین رقم طراز ہیں:

"دنیا کا شاید ہی کوئی غم ہو جو غالب کے حصے میں نہ آیا ہو۔ بچپن ہی میں سایۂ پدری کا اٹھ جانا، بھائی کی دیوانگی، اولاد سے محرومی، اقتصادی پریشانیوں کا نرغہ، عارف کی ناوقت موت، شریکِ حیات کی مفارقت، دلی کا اجڑنا، بھائی کا مرنا، مختصر یہ کہ غموں کا ایک ہجوم تھا جس میں غالب تمام عمر گھرے رہے ..... انھوں نے خالقِ کائنات سے غموں کا شکوہ کرنے کے بجائے صرف یہ مطالبہ کیا کہ ؎

میری قسمت میں غم، گر اتنا تھا
دل بھی یارب کئی دیے ہوتے

عرض ہے کہ عارف کا انتقال اپریل ۱۸۵۲ء میں ہوا اور اُن کی بیوی کا اُن سے تین چار ماہ پہلے، غالب کی بیگم غالب کی وفات کے ایک سال بعد فوت ہوئیں، دلی ۱۸۵۷ء میں اجڑی، بھائی (مرزا یوسف) ۱۸ اکتوبر ۱۸۵۷ء کو مرے، جبکہ مندرجہ بالا شعر ۱۸۴۷ء کے کچھ ہی عرصے بعد کا فکر کردہ ہے۔ بتائیے اس کا اطلاق ان واقعات پر کیونکر ہو سکتا ہے؟ یوں بھی اگر اس غزل کے باقی تین شعر (کُل چار شعر ہیں) دیکھیے تو ان میں داستانِ غم کی کوئی جھلک دکھائی نہیں دیتی۔ یہ میر کے اس شعر کی ترقی یافتہ شکل ہے اور ایسے شعر ہر غزل گو کے یہاں پائے جاتے ہیں:

کاشکے دل دو تو ہوتے عشق میں ❊ ایک رکھتے ایک کو تیرِ عشق میں

[1] مطبوعہ ادارۂ فروغِ اردو لکھنؤ فروری ۱۹۷۱ء ص ۵

اس ادھوری غزل کا مقطع بھی میرؔ ہی کے یہاں سے اخذ کیا ہوا معلوم ہوتا ہے ۔ میرؔ کہتے ہیں :

اس کے ایفائے عہد تک نہ جیے
عمر نے ہم سے بے وفائی کی

مرزاؔ نے اسے یوں کر لیا :

آہی جاتا وہ راہ پر غالبؔ
کوئی دن اور بھی جیے ہوتے

اسی مضمون کا ایک شعر قائمؔ کے یہاں بھی ہے :

بعد خط آنے کے اس کے تھا وفا کا احتمال
لیک واں تک عمر نے اپنی وفاداری نہ کی

حالیؔ نے 'یادگارِ غالبؔ' میں 'لطیفے' کے تحت لکھا ہے

" ایک دفعہ مولوی عبدالقادر رامپوری نے جو نہایت ظریف الطبع تھے اور جن کو چند روز قلعہ دہلی سے تعلق رہا تھا، مرزا سے کسی موقع پر یہ کہا کہ آپ کا ایک اردو شعر سمجھ میں نہیں آتا اور اسی وقت دو مصرعے خود موزوں کر کے مرزا کے سامنے پڑھے :

پہلے تو روغنِ گُل بھینس کے انڈے سے نکال
پھر دوا جتنی ہے گُل بھینس کے انڈے سے نکال

مرزا یہ سن کر سخت حیران ہوئے اور کہا : 'حاشا' یہ شعر میرا نہیں ہے ۔ مولوی عبدالقادر نے ازراہِ مزاح کہا میں نے خود آپ کے دیوان میں دیکھا ہے اور دیوان ہو تو میں اب دکھا سکتا ہوں ۔ آخر مرزا صاحب کو معلوم ہوا کہ مجھ پر اس پیرائے میں اعتراض کرتے ہیں اور گویا یہ جتاتے ہیں کہ تمہارے دیوان میں اس قسم کے

اشعار ہوتے ہیں ..... "

اس لطیفے سے یہ نتائج اخذ کیے جا سکتے ہیں

(۱) گفتگو مولوی عبدالقادر رامپوری اور غالبؔ کے مابین ہوئی تھی مگر اس کے راوی کا علم نہیں ۔

(۲) مولوی صاحب کو چند روز قلعے سے تعلق رہا تھا ۔ ظاہر ہے کہ غالبؔ سے ملاقات اور گفتگو اسی زمانے میں ہوئی ہوگی ۔

(۳) غالبؔ کا دیوان چھپ چکا تھا جبھی تو مولوی صاحب نے کہا کہ " دیوان ہو تو میں اب دکھا سکتا ہوں " ۔

مولوی عبدالقادرؔ[1] رامپوری ۱۸۳۸ء میں ضلع مراد آباد میں صدر الصدور تھے ۔ اسی سال ملازمت ترک کر کے دلی آ گئے ۔ وہ رامپور میں پیدا ہوئے ، رامپور اور مراد آباد میں تعلیم پائی اور ۱۸۰۹ء میں ضلع مراد آباد ہی میں سرکار کمپنی کے ملازم ہوئے ۔ بقول ڈاکٹر محمد ایوبؔ قادری[2]

" ..... ۱۸۱۴ء میں بسلسلۂ ملازمت دہلی پہنچے اور ۱۸۱۵ء میں واپس آ گئے اور ۱۸۱۷ء میں دوبارہ گئے اور ۱۸۱۸ء میں اُن کا تبادلہ اجمیر ہو گیا ..... "

اجمیر ، راجستھان ، جبلپور ، ناگپور میں بڑے بڑے عہدوں پر ملازم رہے ۔ اخیر مراد آباد میں صدر الصدور مقرر ہوئے ۔

حالیؔ ۱۸۳۷ء میں پیدا ہوئے ، وہ ۱۸۵۴ء میں بعمر ۱۷ سال دلی آئے تھے ۔ ظاہر ہے (۱) کہ حالیؔ نے یہ روایت کسی سے سُنی ہے خود مولوی صاحب نے انھیں نہیں بتائی کیونکہ وہ ۱۸۴۹ء میں فوت ہو چکے تھے ۔ شاید شیفتہؔ اُس کے راوی ہوں ۔

(۲) دلی آنے کے بعد مولوی صاحب ۶ ماہ شاہ ظفرؔ کے پاس رہے ۔ بقول ڈاکٹر محمد ایوبؔ

---

[1] مفتی مولوی عبدالقادر خاں تخلص غمگینؔ متوفی ۱۸۴۹ء ۔ تذکرہ کاملانِ رامپور ص ۲۳۴

[2] غالبؔ اور عصرِ غالبؔ ۔ مطبوعہ کراچی ۱۹۸۲ء ص ۱۸۹

قادری" بہادر شاہ ظفر کے دربار میں مولوی عبدالقادر تقریباً ۱۲۵۷ھ (۱۸۴۰ء) میں وکیل مقرر ہوئے"۔ شیفتہ اور غالب کے تعلقات تو تھے ہی۔ معلوم ہوتا ہے شاہ ظفر کی ملازمت کے بعد بھی مولوی صاحب چندے دلّی ہی میں رہے کیونکہ (۳) غالب کا دیوانِ اُردو (پہلا ایڈیشن) ۱۸۴۱ء میں چھپا اور ظاہر ہے یہ بات اُنھی دنوں کی ہوگی ورنہ وہ دیوان دیکھنے کی بات کیوں کرتے۔

یہ روایت تذکرۂ کاملانِ رام پور میں بھی درج ہے۔ اُس میں لکھا ہے کہ مرزا غالب "گھر آکر دیوان کو دیکھتے ہیں، پریشان ہوکر ایک ایک سے دریافت کرتے ہیں کہ بھائی یہ شعر (پہلے تو روغنِ گل ......) کہاں ہے۔ نواب مصطفےٰ خان شیفتہ نے کہا کہ مولوی صاحب نے آپ کے کلام سے ظرافت کی ہے"۔

یہ واقعہ بیان کرنے کے بعد حالی "یادگارِ غالب" میں لکھتے ہیں:

"مرزا نے اس قسم کی نکتہ چینیوں پر اُردو فارسی دیوان میں جابجا اشارہ کیا ہے۔ اُردو میں ایک جگہ کہتے ہیں ۔

نہ ستایش کی تمنّا، نہ صلے کی پروا
گر نہیں ہیں مرے اشعار میں معنی، نہ سہی

ایک اور اُردو غزل کا مطلع ہے ۔

گر خامشی سے فائدہ اخفائے حال ہے
خوش ہوں کہ میری بات سمجھنی محال ہے"

مگر یہ دونوں شعر تو نسخۂ بھوپال (حمیدیہ)، مکتوبہ ۱۸۲۱ء کے متن میں موجود ہیں۔ ظاہر ہے کہ سن و سال کے لحاظ سے ان کا اطلاق ۲۰ سال بعد کے واقعے پر نہیں ہوسکتا۔ حقیقت یہ ہے کہ غالب نے ایسے اشعار اور بھی کہے ہیں۔ جیسے ۔

مشکل ہے زبس کلام میرا اے دل　　سُن سُن کے اسے سخنورانِ کامل
آسان کہنے کی کرتے ہیں فرمایش　　گویم مشکل وگرنہ گویم مشکل

نسخۂ بھوپال (حمیدیہ) ۱۸۲۱ء

آگہی دامِ شنیدن جس قدر چاہے بچھائے　　مدّعا عنقا ہے اپنے عالمِ تقریر کا

۱۸۲۱ء نسخۂ حمیدیہ (حاشیہ)، ۱۸۲۶ء نسخۂ شیرانی (متن)

ہمارے شعر ہیں اب صرف دل لگی کے اسدؔ　　کھُلا کہ فائدہ عرضِ ہنر میں خاک نہیں

نسخۂ شیرانی ۱۸۲۶ء

مگر یہ سب کے سب اسی عہد کے ہیں کوئی ۱۸۲۶ء کے بعد کا نہیں۔ اس لیے انھیں ۱۸۴۱ء کے کسی واقعے سے مربوط کرلینا قطعی نادرست ہے۔ ۱۸۲۶ء کا وہ زمانہ ہے جب غالب طرزِ بیدل سے آزاد ہوتے ہیں اور یہی وہ زمانہ ہے جب اُنھوں نے فارسی میں باقاعدگی سے کہنا شروع کیا مگر چونکہ اس وقت تک وہ بیدل (اور اسیر و شوکت) کی طلسماتی گرفت سے نکل چکے تھے، اس لیے فارسی کلام پر ان کی چیستانی طرز کا اثر نمایاں نہیں ہے۔ اس عہد کے بعد کا اُردو کلام بھی بیشتر اس طرزِ سخن سے پاک ہے۔

جنابِ خورشید الاسلام مکتوبِ غالب بنام علائی سے اقتباس پیش کرتے ہیں[1]

"پچاس برس کی بات ہے کہ الٰہی بخش مرحوم نے ایک زمین نکالی، میں نے حسب الحکم غزل لکھی۔ بیت الغزل ۔

پلا دے اوک سے ساقی جو مجھ سے نفرت ہے
پیالہ گر نہیں دیتا، نہ دے شراب تو دے"

پھر لکھتے ہیں "یہ خط ۱۸۶۲ء کا ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ یہ غزل ۱۸۱۲ء میں لکھی گئی تھی۔ اور اس وقت غالب کی عمر محض ۱۵ سال یا اس سے بھی کم تھی۔ اس قسم کی نشو و نما کا یہ نتیجہ ہوتا ہے کہ آدمی پردہ کے رنگ سے خوش یا مطمئن ہوجانے کے بجائے یہ جستجو کرنے لگتا ہے کہ اس کے پیچھے کیا ہے ......" حقیقت یہ ہے کہ یہ غزل پہلے پہل ۱۸۲۱ء کے مخطوطے کے حاشیے میں ملتی ہے تب غالب کی عمر ۱۵ سال کی نہیں بلکہ ۲۴ سال سے زیادہ کی تھی۔

۱۔ غالب۔ تقلید اور اجتہاد۔ اشاعتِ سوّم ۱۹۷۹ء ص ۲۹

ظاہر ہے کہ غزل ۱۸۲۱ء اور ۱۸۲۶ء کے درمیان کسی وقت بھی کہی گئی تھی ۱۸۱۲ء میں نہیں۔

غالبؔ نے شاہ ظفر کی طرف سے ایک مثنوی، شیعت سے براءت کے مضمون کی ۱۸۵۳/۵۴ء میں کہی تھی۔ اس پر بڑا ہنگامہ ہوا۔ غالبؔ بھی اس کی زد میں آ گئے۔ زچ ہو کر سلطان العلماء مولوی سیّد محمّد لکھنوی کو لکھتے ہیں :

"اب وقت آگیا ہے کہ غزل کے پردہ میں اپنے عقیدہ کا اظہار کروں تاکہ دنیا کو معلوم ہو جائے کہ کُنجِ ناکامی کے خاک نشیں کے دل میں کیا ہے[۱] ...."

اب سوال یہ ہے کہ غالبؔ کی، اس "غزل" سے مراد، کون سی غزل ہے جس میں وہ اپنا دل کھول کر رکھ دینا چاہتے تھے۔ حاشیے میں مہاجر صاحب "مشغولِ حق ہوں بندگیِ بُوتراب میں" کے مقطعے والی غزل کو یہ غزل قرار دیتے ہیں، مگر یہ غزل تو دیوانِ غالبؔ مطبوعہ ۱۸۴۷ء کے متن میں موجود ہے گویا ۱۸۴۷ء یا اس سے پہلے کہی گئی تھی ــ اسے ۱۸۵۳/۵۴ء کی فکر کردہ کیونکر کہا جا سکتا ہے؟ حقیقت یہ ہے کہ غالبؔ کا اشارہ اُس غیر متداول ۱۲ شعری سلام کی طرف ہے، جو ۱۸۵۴ء میں کہا گیا تھا اور جس کا مطلع یہ ہے ؎

سلام اسے کہ اگر بادشا کہیں اُس کو
تو پھر کہیں کہ کچھ اس سے سوا کہیں اُس کو

مندرجہ بالا چند مثالوں سے بخوبی ظاہر ہے کہ جب تک غالبؔ کے تمام کلام کا تاریخی ترتیب سے مطالعہ نہ کیا جائے گا، ہم نتائج اخذ کرنے میں اکثر ٹھوکر کھاتے رہیں گے۔ مَیں نے اسی مقصد کو رہنما بنا کر اس کام کا بیڑا اُٹھایا ہے۔ تاریخی ترتیب ہی سے غالبؔ کے سوانحی اور فکری ارتقا کا صحیح تجزیہ ہو سکے گا۔ ہماری خوش قسمتی ہے کہ غالبؔ کے اُردو کلام کے کئی ایک مخطوطے فراہم ہو چکے ہیں۔ جو اُن کے مختلف فکری اَدوار کی نشاندہی کرتے ہیں اور پھر مولانا امتیاز علی خاں عرشیؔ مرحوم کا مرتّبہ 'دیوانِ غالبؔ' موجود ہے جو کسی نعمتِ عُظمیٰ سے کم نہیں۔

[۱] اقتباس از پنج آہنگ، اُردو ترجمہ از مہاجر۔ پاکستان

تعارف

غالبؔ کی زندگی میں ان کا مجموعۂ کلامِ اُردو پانچ بار چھپا۔ اس کا نام انھوں نے دیوانِ غالبؔ رکھا۔ پہلے دو ایڈیشنوں کے سرورق کی عبارت میں 'دیوان' کا لفظ موجود ہے، اگرچہ سرورق پر "دیوانِ غالبؔ" کا عنوان طبع نہیں ہوا ہے، البتہ آخری تین ایڈیشنوں کا عنوان "دیوانِ غالبؔ" ہی ہے جو اُن کے سرورق پر نمایاں طور پر دیکھا جا سکتا ہے۔ اشاعتوں کی تفصیل یہ ہے۔

پہلا ایڈیشن	مطبعِ سیّدالاخبار، دِلّی	اکتوبر ۱۸۴۱ء کل شعر ۱۰۹۶[۱]
دوسرا ایڈیشن	مطبعِ دارالسّلام، دِلّی	مئی ۱۸۴۷ء " " ۱۱۵۸[۲]
تیسرا ایڈیشن	مطبعِ احمدی، دِلّی	۲۹ جولائی ۱۸۶۱ء " " ۱۷۹۶
چوتھا ایڈیشن	مطبعِ نظامی، کانپور	جون ۱۸۶۲ء " " ۱۸۰۲

[۱] اس بحث کے لیے دیکھیے دیوانِ غالبؔ [اکتوبر ۱۸۴۱ء] (عکسی) کا پیش لفظ مطبوعہ ۱۹۸۶ء

[۲] " " " " " [جون ۱۸۶۲ء] (عکسی) کا پیش لفظ مطبوعہ ۱۹۸۷ء

پانچواں ایڈیشن مطبعِ مفید خلائق، آگرہ بعد از جون ۱۸۶۳ء کل شعر ۱۷۹۵

جیسا کہ آپ نے ملاحظہ کیا، چوتھے ایڈیشن یعنی مطبعِ نظامی کے نسخے میں کلام سب ایڈیشنوں سے زیادہ ہے یعنی اس میں ۱۸۰۲ شعر ہیں۔ اس کے برعکس جو نسخہ اس وقت آپ کے مطالعے میں ہے اس کے متن میں ایک مصرعے کی کمی کے ساتھ ۱۸۰۴ شعر پیش کیے گئے ہیں۔ ان میں وہ چند شعر شامل ہیں جو غالب کے نہیں مگر جن کو غالب نے تضمین کر کے اپنا بنا لیا ہے مگر وہ ۱۷ شعر اور ۶ مصرعے شامل نہیں جو محض غالب کی شوخیِ طبع اور حاضر دماغی کے آئینہ دار ہیں اور کسی ادبی حیثیت سے عاری ہیں۔ تاہم ایسے اشعار کو "غالب کے کچھ ہنگامی مصرعے اور شعر" کے عنوان سے مقدمے میں شامل کر لیا گیا ہے تاکہ یہ مواد بھی قاری کی نگاہوں سے اوجھل نہ رہے۔ "دیوانِ غالب کامل"..... پہلے دو ایڈیشنوں کے متن سے میں نے ۳۰ اشعار خارج کر کے الگ سے ایک باب "حرفِ نامعتبر" قائم کر دیا ہے جو مقدمے میں شامل ہے۔ ان اشعار کے بارے میں یقینی طور پر نہیں کہا جا سکتا کہ یہ غالب ہی کے فکر کردہ ہیں۔ اس طرح اب اس ایڈیشن میں صحیح تعدادِ اشعار یوں ہو گی:

متن	۱۷۹۴ شعر	=	۸۳۵۷ مصرعے
ہنگامی مصرعے	— شعر	=	۶ مصرعے
ہنگامی شعر	۱۷ شعر	=	۳۴ مصرعے
"حرفِ نامعتبر"	۳۰ شعر	=	۶۰ مصرعے
میزان	۴۲۲۶ شعر	=	۸۴۵۷ مصرعے

ضخامت اور تعدادِ اشعار کے پیشِ نظر اسے غالب کے اردو کلام کا کلیات کہنا چاہیے مگر میں نے غالب کے مجموعہ کلامِ اردو کی روایت کو ملحوظِ خاطر رکھتے ہوئے اس کا نام "دیوانِ غالب" ہی رہنے دیا ہے۔ صرف ایک لفظ 'کامل' کا اضافہ کر دیا ہے یعنی "دیوانِ غالب (کامل)"۔ ظاہر ہے کہ اس میں غالب کے متداول ۱۸۰۲ اشعار بھی

آ گئے ہیں۔

میں نے مندرجۂ ذیل درجۂ اوّل کے، ۱۹ ماخذوں کی مدد سے غالب کے کلامِ اردو کے گیارہ ادوار قائم کیے ہیں جو مع تعدادِ اشعار یہ ہیں۔ اسی جدول میں یہ بھی دکھا دیا گیا ہے کہ ہر دور کے جملہ اشعار میں سے کتنے شعر متداول دیوان کے لیے انتخاب کیے گئے۔ درجۂ دوم کے ماخذ نظر انداز کر دیے ہیں۔

ادوار	کُل اشعار	دیوان کے لیے منتخب اشعار
..... تا ۱۸۱۲ء	۴۴	۴
۱۸۱۳ء تا ۱۸۱۶ء	۱۷۴۰	۳۰۸
۱۸۱۷ء تا ۱۸۲۱ء	۸۰۱	۴۴۱
۱۸۲۲ء تا ۱۸۲۶ء	۱۷۹	۱۵۲
۱۸۲۷ء تا ۱۸۲۸ء	۱۰۰	۹۵
ستمبر ۱۸۲۸ء تا ۱۸۳۳ء	۸۴	۷۳
۱۸۳۴ء تا ۱۸۴۷ء	۸۹	۸۵
۱۸۴۸ء تا ۱۸۵۲ء	۴۵۲	۳۹۳
۱۸۵۳ء تا ۱۸۵۶ء	۴۲۹	۲۴۵
مئی ۱۸۵۷ء تا ۱۸۶۲ء	۸۶	۶
۱۸۶۳ء تا ۱۸۶۷ء	۱۷۵	-
میزان	۴۱۷۹	۱۸۰۲

ماخذوں کی تفصیل یہ ہے:

(۱) تذکرۂ عیار الشعراء (۲) تذکرۂ عمدۂ منتخبہ مطبوعہ (۳) نسخۂ بھوپال بخطِ غالب۔

تین عکسی اشاعتیں، عرشی زادہ، کمال احمد صدیقی، نقوش لاہور (۴) نسخۂ بھوپال مشمولہ نسخۂ حمیدیہ۔ تین مطبوعہ نسخے مرتبہ مفتی محمد انوار الحق، چوتھا مطبوعہ نسخہ مرتبہ حمید احمد خاں (۵) نسخۂ شیرانی۔ عکسی اشاعت (۶) گلِ رعنا۔ قلمی اور مطبوعہ (۷) نسخۂ رام پور اوّل یا قدیم (۸) انتخابِ غالب (۹) نسخۂ بدایوں (۱۰) دیوانِ غالب پہلا مطبوعہ ایڈیشن (۱۱) نسخۂ دیسنہ (۱۲) نسخۂ کریم الدین یا نسخۂ کراچی (۱۳) دیوانِ غالب دوسرا مطبوعہ ایڈیشن (۱۴) نسخۂ لاہور (۱۵) نسخۂ رام پور ثانی یا جدید (۱۶) قادر نامۂ غالب۔ مطبعِ نظامی کانپور ۱۲۹۵ھ، فیضِ محمدی لکھنؤ ۱۸۹۲ء، مصری لال پریس ہاتھرس ۱۸۹۶ء (۱۷) دیوانِ غالب تیسرا مطبوعہ ایڈیشن (۱۸) دیوانِ غالب چوتھا مطبوعہ ایڈیشن (۱۹) دیوانِ غالب پانچواں مطبوعہ ایڈیشن۔

اِن میں سے مندرجہ ذیل ۸ ماخذ مَیں نے نہیں دیکھے۔ اس لیے اِن کے لیے کلّی طور پر دیوانِ غالب مرتبہ عرشیؔ (اشاعتِ دُوم) سے استفادہ کیا گیا ہے۔ باقی تمام ماخذ میرے کتب خانے کے غالب کلکشن میں موجود ہیں:

(۱) تذکرۂ عیار الشّعرا (۲) نسخۂ رام پور اوّل یا قدیم (۳) انتخابِ غالب (۴) نسخۂ بدایوں (۵) نسخۂ دیسنہ (۶) نسخۂ کریم الدین (۷) نسخۂ لاہور (۸) نسخۂ رام پور ثانی یا جدید۔

کلام کے زمانۂ فکر کے تعیّن کے لیے یہ قاعدہ اختیار کیا گیا ہے کہ اگر کسی ماخذ کی غزل کا ایک شعر بھی کسی قدیم تر ماخذ میں پایا گیا ہے تو اس پوری غزل کو قدیم تر ماخذ میں شامل سمجھا گیا ہے کیونکہ پوری غزل نہ کہی گئی ہو تو بھی اُس کی اساس اسی عہد میں رکھی گئی تھی۔ اسی طرح اگر بعد کے عہد میں کوئی شعر اُسی زمین (قافیہ ردیف اور وزن) میں پایا گیا ہے جس میں پوری غزل قدیم تر ماخذ میں موجود ہے تو اس کو بھی قدیم تر عہد میں کہی ہوئی غزل کی توسیع مان کر قدیم تر ماخذ میں شامل کیا گیا

ہے، مگر ایسے اشعار کی تعداد زیادہ نہیں۔

اگرچہ اوقاف، اعراب، املا اور روایتِ اشعار کے لیے نسخۂ عرشیؔ پیشِ نظر رکھنا ناگزیر تھا تاہم بہت سے مقامات پر اس سے گریز بھی کیا گیا ہے۔ اُمیدؔ ہے کہ اس اختلاف کو پسندیدگی کی نظر سے دیکھا جائے گا۔

ق (۱۸۲۱ء) اور اس کے بعد کے کلام سے متعلق اختلافِ نسخ کہیں واضح نہیں کیا گیا کیونکہ یہ کام نسخۂ عرشیؔ میں احسن طریقے سے انجام دیا گیا ہے۔ البتّہ دیوانِ غالب زیرِ مطالعہ کے ۱۷۹۴ اشعار میں سے پہلے ۱۷۸۴ اشعار کا اختلافِ نسخ از سرِ نو تیار کر کے درج کر دیا گیا ہے۔ اس کے دو سبب ہیں اوّل یہ کہ یہ اشعار بیشتر نسخۂ دیوانِ غالب بخطِ غالبؔ (رخ) مکتوبہ ۱۸۱۶ء سے متعلّق ہیں جس کا اختلافِ نسخ کسی وجہ سے دیوانِ غالب نسخۂ عرشیؔ میں باقاعدہ شامل نہ ہو سکا تھا، دُوم اس سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ رخ کا کلام نسخۂ حمیدیہ (ق) مکتوبہ ۱۸۲۱ء سے یقیناً پہلے کا ہے اور جیسا کہ بعض ناقدوں نے قیاس کیا تھا، جعلی نہیں ہے۔

بہت سے اشعار کے درمیان یا آگے، اور نظموں، قصیدوں قطعوں وغیرہ کے عنوانات کے نیچے 'م' کا نشان بنا دیا گیا ہے۔ یہ اس بات کی پہچان ہے کہ یہ کلام متداول دیوانِ غالب میں شامل ہے۔ اس نسخے میں حواشی کثرت سے ہیں اور بیشتر حوالوں کے ساتھ ہیں۔ ان حاشیوں میں اگر کوئی عبارت واوین میں بغیر حوالے کے ہے تو اسے دیوانِ غالب نسخۂ عرشیؔ سے ماخوذ سمجھا جائے۔

نسخۂ زیرِ نظر میں غالب کا آج تک کا دریافت شدہ پورا اُردو شعری کلام تاریخی ترتیب سے درج ہے یعنی سب سے پہلے وہ اشعار دیے گئے ہیں جو سب سے پہلے تخلیق ہوئے، اس کے بعد اس کی تخلیقات مابعد۔ چونکہ یہ ممکن نہ تھا کہ ہر نظم یا غزل کی تاریخ فکر معلوم ہو سکے۔ اس لیے 'تاریخی ترتیب' کو (جیسا کہ پہلے بیان کیا جا چکا ہے) عہد کے لحاظ سے بانٹ دیا گیا ہے۔ اسی بات کو دھیان میں رکھتے ہوئے مقدمے کے آخر

میں ایک باب "توقیتِ غالبؔ" کے عنوان سے بڑھا دیا گیا ہے، تاکہ اشعار کے زمانۂ فکر کے ساتھ اگر کوئی صاحب شاعر کی اُس عہد کی نجی سرگرمیوں کا بھی موازنہ کرنا چاہیں تو انہیں کوئی دقّت نہ ہو۔

غالبؔ کے دیوان اُردو کا پہلا ایڈیشن اکتوبر ۱۸۴۱ء میں چھپا لیکن اسے کم از کم ساڑھے آٹھ سال پہلے مرتّب کیا جا چکا تھا۔ یہ دیباچے سے ظاہر ہے جو غالبؔ نے ۱۶ اپریل ۱۸۳۲ء کو تمام کیا تھا۔ اس کی تقریظ جو دیوان کے آخر میں شامل ہے نواب ضیاء الدّین احمد خاں نیّر و رخشاں نے ۱۸۳۸ء / ۱۸۳۹ء میں لکھّی تھی۔ لہٰذا دیباچۂ غالبؔ اور تقریظِ نواب ضیاء الدّین احمد خاں کے درمیانی پانچ سالہ وقفے میں پہلے ایڈیشن کے لیے ترتیب دیے ہوئے دیوان میں اضافے ہوتے رہے جنھیں بآسانی دیوانِ زیرِ مطالعہ میں اپنے مقام پر ملاحظہ کیا جا سکتا ہے۔ دیوانِ غالبؔ کے دوسرے ایڈیشنوں میں بھی غالبؔ کا لکھا ہوا دیباچہ اور نواب ضیاء الدّین احمد خاں کی تقریظ دونوں شامل ہیں۔ صرف چوتھے ایڈیشن مطبع نظامی میں تقریظ شامل نہیں۔ اعداد و شمار کے علاوہ تقریظ میں معمولی ترمیم ہوئی ہے مگر دیباچۂ غالبؔ میں کوئی ترمیم نہیں ہوئی۔ قاری کی دلچسپی کے لیے دیباچہ اور تقریظ پر الگ سے ایک باب قائم کر دیا گیا ہے کیونکہ صرف دیباچہ اور تقریظ درج کر دینے سے بات پوری نہیں ہوتی تھی۔

اگرچہ اب غالبؔ کا مرتّب کردہ کلامِ اُردو (دیوانِ غالبؔ) اس نسخے میں ضم ہو کر، کتابی شکل میں اپنی علاحدہ حیثیت نہیں رکھتا تاوقتیکہ 'م' کے نشان والے کلام کو از سرِ نو یکجا نہ کیا جائے، پھر بھی اُمیّد ہے کہ غالبؔ کی زندگی میں شائع شدہ دیوانِ غالبؔ کے ایڈیشنوں کے متعلق معلومات حاصل کرنے میں "غالبؔ کی زندگی میں دیوانِ غالبؔ کی اشاعت (دیباچہ، تقریظ، خاتمۃ الطبع اور تعدادِ اشعار)" والا باب معاون ثابت ہوگا۔

غالبؔ کا اوّلین اُردو منظوم کلام

۱۸۹۷ء حالیؔ[1] لکھتے ہیں:

"منشی بہاری لال مشتاقؔ[2] کا بیان ہے کہ لالہ کنھیا لال[3] ایک صاحب آگرے کے رہنے والے جو مرزا صاحب کے ہم عصر تھے، ایک بار دلّی میں آئے اور جب مرزا سے ملے تو اثنائے کلام میں ان کو یاد دلایا کہ جو مثنوی آپ نے پتنگ بازی کے زمانے میں لکھّی تھی، وہ بھی آپ کو یاد ہے؟ اُنھوں نے انکار کیا۔ لالہ صاحب نے کہا وہ اُردو مثنوی میرے پاس موجود ہے۔ چنانچہ اُنھوں نے وہ مثنوی مرزا کو لا کر دی اور وہ اس کو دیکھ کر بہت خوش ہوئے۔ اس کے آخر میں یہ فارسی شعر کسی استاد کا پتنگ کی زبان سے لاحق کر دیا تھا ؎

رشتۂ در گردنم افگندہ دوست ❊ مے کشد ہر جا کہ خاطر خواہ اوست

---

[1] 'یادگارِ غالبؔ' ص ۱۰۷۔ فٹ نوٹ (حالیؔ ۱۸۳۷ء تا یکم جنوری ۱۹۱۵ء)

[2] تلمیذِ غالبؔ۔ (۱۸۳۵ء تا ستمبر ۱۹۰۸ء)

[3] یہ شیو نرائن آرامؔ (۱۰ ستمبر ۱۸۳۳ء تا ۴ ستمبر ۱۸۹۸ء) شاگردِ غالبؔ کے دادا کے چھوٹے بھائی تھے

لالہ صاحب کا بیان تھا کہ مرزا صاحب کی عمر جب کہ یہ مثنوی لکھی تھی آٹھ نو برس کی تھی۔"

قیاس ہے کہ حالی نے غالب کے انتقال کے بعد، شاید اس زمانے سے جب وہ ۱۸۷۵ء میں اینگلو عربک اسکول دہلی میں فارسی اور عربی کے مدرّسِ اوّل مقرّر ہوئے "یادگارِ غالب" کا ڈول ڈالا ہوگا اور انھی ایّام میں بہاری لال مشتاق نے یہ واقعہ انھیں بتایا ہوگا۔ مثنوی یا مشتاق کو یاد نہ رہی ہوگی یا حالی بھول گئے ہوں گے اور آخری فارسی شعر یاد رہ گیا ہوگا۔

۱۹۳۱ء میں بالآخر ایڈیٹر سہ ماہی 'اُردو' اورنگ آباد کے نوٹ کے ساتھ یہ مثنوی شائع ہوئی جس میں درج ہے کہ صفدر مرزا پوری مرحوم نے (یہ مثنوی) بھیجی تھی "جو کاغذوں میں پڑی رہ گئی اور اب شائع کی جاتی ہے ....." صفدر مرزا پوری مرحوم نے اپنے بیان میں کہا ہے کہ اس مثنوی کو "ہمارے محترم بزرگ زاہد (سہارنپوری) مدظلہٗ نے ہماری جدید تالیف 'حسنِ خیال' کے لیے نقل فرما کر" بھیجا .... قیاس ہے کہ "حسنِ خیال"[2] ۱۹۳۱ء کے بعد چھپی۔ اس لیے یہ بیان وہیں سے لے کر یہاں درج کیا جاتا ہے:

مرزا غالب کو بچپن میں پتنگ اُڑانے کا بہت شوق تھا۔ اکبر آباد میں اُن کی پتنگ بازی کا شہرہ تھا۔ اُسی زمانے میں مرزا نے پتنگ کے تلازمے میں کسی کے فارسی شعر مندرجہ ذیل پر بطور ترکیب بند شعر لکھے تھے۔ شعر

رشتۂ در گردنم افگندہ دوست
می بُرد ہر جا کہ خاطر خواہ اوست

لیکن وہ ترکیب بند کسی نے نقل نہیں کیا۔ نہ غالباً کسی کو ملا۔ حضرت زاہد کے

---

[1] سہ ماہی 'اُردو' اورنگ آباد۔ شمارہ جولائی ۱۹۳۱ء ص ۵۱۵

[2] مطبوعہ گیلانی الیکٹرک پریس بک ڈپو اسپتال روڈ لاہور (سنہ اشاعت درج نہیں) ص ۱۰۶

جدِّ مرحوم حاجی وزائر سیّد اکبر علی صاحب بلیغ ابوظفر شاہِ آخر دہلی کے معتمد وکیل تھے اور شاہ کی پنشن کا مقدّمہ جو کمپنی سے لڑا اُس میں اوّل سے آخر تک وکیلِ شاہی کی حیثیت سے اس زمانے میں برابر اکبر آباد میں عدالت العالیہ ہونے کی وجہ سے آتے جاتے رہتے تھے۔ خود بھی ذی علم اور اچھے شاعر تھے۔ اُن کی بیاض میں یہ ترکیب بند لکھا ہوا ملا۔ جو دلدادگانِ کلامِ غالب کے لیے نعمتِ غیر مترقبہ ہے، اگرچہ بچپن کی زبان ہے۔

ترکیب بند

ایک دن مثلِ پتنگِ کاغذی — لے کے دل سررشتۂ آزادگی
خود بخود کچھ ہم سے کنیانے لگا — اس قدر بگڑا کہ سر کھانے لگا
میں کہا اے دل ہوائے دلبراں — بس کہ تیرے حق میں کہتی ہے زباں
پیچ میں ان کے نہ آنا زینہار — یہ نہیں ہیں گے کسو کے یار غار
گوڑے پنڈے پر نہ کر ان کے نظر — کھینچ لیتے ہیں یہ ڈورے ڈال کر
اب تو مل جائے گی تیری ان سے سانٹھ — لیکن آخر کو پڑے گی ایسی گانٹھ
سخت مشکل ہوگا سلجھانا تجھے — قہر ہے دل ان سے الجھانا تجھے
یہ جو محفل میں بڑھاتے ہیں تجھے — بھول مت اس پر اُڑاتے ہیں تجھے
ایک دن تجھ کو لڑا دیں گے کہیں — مفت میں ناحق کٹا دیں گے کہیں
دل نے سُن کر کانپ کر کھایا پیچ و تاب — غوطے میں جا کر دیا کٹ کر جواب

'رشتۂ در گردنم افگندہ دوست
می بُرد ہر جا کہ خاطر خواہ اوست"

صفدر مرحوم نے زاہد سہارنپوری مرحوم کی ایک مثنوی بھی نقل کی ہے جس میں اسی فارسی شعر کو تضمین کیا ہے:

جب مدینے میں نہ پایا کچھ بھی چین — گھر کو چھوڑا آئے مکّے میں حسینؑ

دھاں بھی پہنچے گھات میں اہلِ نفاق — تب کیا قصد آپ نے سوئے عراق
یہ خیال آیا کہ ہو کر قتلِ عام — ہو نہ ضائع حرمتِ بیت الحرام
الغرض گزرے سفر میں پانچ ماہ — بستیوں میں تھی نہ جنگل میں پناہ
یوں رہے کوہ و بیاباں میں رواں — آج اس منزل پہ ٹھہرے کل وہاں
پوچھتا رستے میں زاہد جب کوئی — ہے کدھر کا قصد اے سبطِ نبیؐ
آپ فرماتے تھے جاتا ہوں اُدھر — حق تعالےٰ کی مشیّت ہے جدھر

"رشتۂ در گردنم افگندہ دوست
می بُرد ہر جا کہ خاطر خواہِ اوست"

صفدر مرحوم کے بیان اور دیوانِ غنیؔ سے معلوم ہوا کہ مُلّا طاہر غنیؔ کشمیری نے بھی اس فارسی بیت کو تضمین کیا ہے:

ہندوے دیدم کہ مستِ عشق بود — گفتش زیں جستجویت چیست سود
در جوابم گفت آں زنّار دار — نیست در دستم عنانِ اختیار

"رشتۂ در گردنم افگندہ دوست
می بُرد ہر جا کہ خاطر خواہِ اوست"

مندرجۂ بالا سے دو باتوں کی تحقیق لازم ہوئی اوّل یہ کہ مثنوی کا عہدِ فکر کیا ہے، دوم یہ کہ اس فارسی شعر کا جسے تضمین کیا گیا ہے، خالق کون ہے۔

اوّل حالیؔ، بہاری لال مشتاقؔ شاگردِ غالبؔ کی زبانی روایت بیان کرتے ہوئے بتاتے ہیں کہ مثنوی، غالبؔ نے آٹھ نو سال کی عمر میں کہی تھی۔ صفدرؔ مرزاپوری بتاتے ہیں کہ یہ کلام مرزاؔ کے بچپن میں پتنگ اُڑانے کے زمانے کا ہے اور کہ "بچپن کی زبان ہے" اور مثنوی کے مطالعے کے بعد یہ تسلیم کیے ہی

۱؎ دیوانِ غنیؔ۔ جموں اینڈ کشمیر اکیڈمی ۔۔۔۔ ۱۹۶۲ء ص ۲۴۸

بنتی ہے۔ مرزاؔ ۲۷ دسمبر ۱۷۹۷ء کو پیدا ہوئے۔ اب اگر آٹھ نو سال کو دس سال تسلیم کر لیا جائے تو اس کلام کا زمانۂ فکر ۱۸۰۷ء ہوا۔ گویا غالبؔ کا اوّلین اُردو منظوم کلام جو ہم تک پہنچا وہ یہی ہے اور دس سال کی عمر میں یعنی ۱۸۰۷ء کا کہا ہوا ہے۔ مگر یہ درست نہیں معلوم ہوتا۔ آٹھ، نو یا دس سال کی عمر میں

گورے پنڈے پر نہ کر ان کے نظر
کھینچ لیتے ہیں یہ ڈورے ڈال کر

کی طرح کے عریاں اشعار فکر کرنا ممکن نہیں۔ غالبؔ کی شادی ۷ رجب ۱۲۲۵ھ مطابق ۱۹ اگست ۱۸۱۰ء کو ہوئی تھی۔ اس کے بعد بھی وہ دہلی میں مستقل سکونت اختیار کرنے سے پہلے، آگرے ہی میں رہے تھے۔ شیو نرائن آرامؔ کو لکھتے ہیں (۱۹ اکتوبر ۱۸۵۸ء)

"ایک کڑہ "کشمیرن والا" کہلاتا تھا۔ اس کڑے کے ایک کوٹھے پر میں پتنگ اُڑاتا تھا اور راجہ بلوان سنگھ سے پتنگ لڑا کرتے تھے۔"

راجا بلوان سنگھ[1] (جن سے پتنگ لڑا کرتے تھے) اپنے والد مہاراجا جیت سنگھ کے گوالیار میں ۲۹ مارچ ۱۸۱۰ء کو فوت ہو جانے کے بعد ہی آگرے آئے[2] تھے۔ اس لیے اس مثنوی کو، شادی کے بعد، ۱۸۱۰ء تا ۱۸۱۲ء کی فکر کردہ کہنا زیادہ قرینِ قیاس ہوگا۔

دوم ۔۔۔ رشتۂ در گردنم افگندہ دوست
می بُرد ہر جا کہ خاطر خواہِ اوست

حالیؔ (۱۸۹۷ء) اور بہاری لال مشتاقؔ (اس سے بھی کئی برس پہلے) اسے کسی استاد کا شعر بتاتے ہیں۔ صفدرؔ مرزاپوری مرحوم بھی اسے "کسی کا فارسی شعر" کہتے

۱؎ ولادت ۱۷۹۹ء گنجینۂ جاوید

۲؎ غالبؔ۔ احوال و آثار۔ ڈاکٹر حنیف نقوی ص ۱۴

ہیں۔ غلام رسول مہر[1] اور مولانا عرشی مرحوم بھی شعر کے خالق کے بارے میں خاموش ہیں۔

فرہنگ آنندراج[2] میں رشتہ کے تحت درج ہے۔

".... وآنکہ درویشاں برمیاں بندند وعیاراں ببام افگنند۔ چنانچہ گفتہ اند

رشتۂ در گردنم افگندہ دوست

می کشد ہر جا کہ خاطر خواہِ اوست"

فرہنگ آنندراج میں یہ حوالہ فرہنگِ انجمن آرائے ناصری سے لیا گیا ہے۔ جو ۱۲۸۸ھ (۷۲-۱۸۷۱ء) میں تالیف ہوئی تھی۔ ان دونوں میں بھی شعر کے خالق کا ذکر نہیں۔

اس شعر کا قدیم ترین اندراج جو ابھی تک ہماری نظر سے گزرا ہے وہ یہی غنی کشمیری کے کلام میں ہے جو اوپر بیان ہوا ہے۔ غنی کشمیری کا انتقال ۱۶۶۹ء میں ہوا تھا[3]

کئی برس ہوئے جنابِ مشفق خواجہ (کراچی پاکستان) نے ازراہِ کرم "ن م۔ راشد ایک مطالعہ" مرتبہ ڈاکٹر جمیل جالبی بھجوائی۔ اس کے ص ۲۸۸ پر ن۔م۔ راشد مرحوم نے اپنے خط، بنام ڈاکٹر جمیل جالبی، مورخہ ۲۶ مارچ ۱۹۷۵ء میں لکھا ہے۔

" درگلویم رشتہ اے[4] افگندہ دوست

می بُرد ہر جا کہ خاطر خواہِ اوست

یہ رومی کا شعر ہے۔ آج کل نئے سرے سے مثنوی (مولوی معنوی) پڑھ رہا ہوں"۔

۱۔ 'غالب' از مہر۔ چوتھا ایڈیشن مطبوعہ دسمبر ۱۹۴۶ء ص ۵۰۴ حاشیہ

۲۔ جلد دوم ص ۱۹۹۶ مطبوعہ نولکشور لکھنؤ ۱۸۹۴ء

۳۔ پارسی سرایانِ کشمیر ص ۳۶، تذکرۂ شمع انجمن ص ۳۴۰

۴۔ حالی نے مصرعِ ثانی میں می برد کی جگہ می کشد لکھا ہے۔ فرہنگِ آنندراج (انجمن آرائے ناصری) میں بھی می کشد ہی ہے۔ مگر صفدر مرزا پوری مرحوم نے تینوں جگہ می برد لکھا ہے۔ راشد صاحب کا لکھا ہوا " درگلویم رشتہ اے....." کسی اور جگہ دیکھنے میں نہیں آیا

چلیے، یہ مسئلہ حل ہو گیا۔ تاہم میں نے اپنی تسلی کے لیے مثنوی مولوی معنوی دیکھی اور اس کے چھیوں دفتر راتوں رات چھان مارے مگر یہ شعر کہیں نہ ملا۔ اس قسم کے قوافی تو بہت سے ملے۔ شعر بھی مثنوی مولانائے روم[1] ہی کے وزن میں ہے اور اسلوب سے بھی مثنویت ٹپکتی ہے مگر شعر عنقا کی طرح غائب پایا۔ غنی کشمیری کے کلام سے واضح ہے کہ شعر ساڑھے تین سو سال پرانا ضرور ہے۔ تو پھر یہ شعر کس کا ہے؟

مولانا غلام رسول مہر[2] نے اس مثنوی کا ذکر کرتے ہوئے یادگارِ غالب[3] (ص ۹۷) کا حوالہ دیا ہے اور پوری مثنوی درج کی ہے جبکہ یادگارِ غالب میں صرف وہ فارسی شعر درج ہے جو مثنوی میں تضمین کیا گیا ہے، مثنوی نہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ مہر مرحوم نے یہ مثنوی، یا رسالہ سہ ماہی اردو اورنگ آباد (جولائی ۱۹۳۱ء ص ۵۱۵) سے لی ہے یا پھر 'حسنِ خیال' (ص ۱۰۶) سے، مگر حوالہ یادگارِ غالب کا دے دیا ہے اور پھر یہ بھی لکھا ہے کہ

" ایک صاحب حاجی سید اکبر بلیغ سہارنپوری تھے ...... انھوں نے ایک بیاض یادگار چھوڑی تھی جس میں یہ مثنوی بھی مرقوم تھی۔ میں اسے تبرکاً یہاں نقل کرتا ہوں ________"

یہ عبارت تاثر دیتی ہے کہ وہ بیاض جس میں یہ مثنوی مرقوم تھی، مہر مرحوم نے دیکھی تھی اور مثنوی وہاں سے لے کر انھوں نے درجِ کتاب کی ہے مگر یہ سراسر غلط ہے۔ رسالہ اردو، حسنِ خیال، اور غالب از مہر کی تحریروں سے بخوبی روشن ہے کہ مثنوی اور اس کے دستیاب ہونے کے کوائف مہر مرحوم نے رسالہ اردو یا حسنِ خیال سے نقل کیے ہیں

۱۔ مولانا روم کا انتقال ۱۷/۱۲/۱۲۷۳ء میں ہونا تسلیم کیا جاتا ہے

۲۔ 'غالب' طبعِ چہارم۔ دسمبر ۱۹۴۶ء ص ۵۰۴/۵۰۹ حاشیہ

۳۔ نہ جانے یہ یادگارِ غالب کے کون سے ایڈیشن کا حوالہ ہے۔ پہلے ایڈیشن میں اسے ص ۷۰ پر دیکھا جا سکتا ہے

نہ کہ اصل بیاض سے۔ اس کے علاوہ مہر مرحوم نے مندرجہ ذیل تصرفات بھی کیے ہیں جو بغیر حوالے کے ہیں۔

رسالہ اُردو	حُسنِ خیال	غالب از مہر
بس کہ تیرے حق میں کہتی ہے زباں	بس کہ تیرے حق میں کہتی ہے زباں	بس کہ تیرے حق میں کہتی ہے زیاں
گورے پنڈے پر نہ کر ان کے نظر	..... ایضاً	..... نہ ان کے کر نظر
اب تو مل جائے گی ان سے تیری سانٹھ	..... تیری ان سے سانٹھ	..... ان سے تیری سانٹھ
ایک دن تجھ کو لڑا دیں گے کہیں	..... ایضاً	..... اڑا دیں گے کہیں

جناب عرشی مرحوم نے، مہر مرحوم کی پیروی کرتے ہوئے "بس کہ تیرے حق میں کہتی ہے زباں" کی جگہ "بس کہ تیرے حق میں رکھتی ہے زیاں" لکھا ہے۔ میرے خیال میں چونکہ زاہد سہارنپوری مرحوم نے مثنوی اصل بیاض سے نقل کر کے صفدر مرزا پوری کو بھیجی تھی جو سب سے آخر میں صفدر مرزا پوری کی زیر نگرانی ان کی مؤلفہ کتاب 'حُسنِ خیال' میں چھپی، اس لیے تمام متنوں پر 'حُسنِ خیال' ہی کے متن کو ترجیح دینی چاہیے۔ میں نے دیوانِ غالب (کامل) میں اسی متن کو جائز رکھا ہے۔ باقی رہی یہ بات کہ دونوں متنوں میں سے اچھا کون سا لگتا ہے تو اس کا حق ہمیں نہیں پہنچتا۔ مثنوی بچپن میں کہی گئی تھی اس لیے اس میں کھوٹا کھرا چھانٹنا عبث ہے۔

عُمدۂ مُنتخبہ میں ذکرِ غالب[1]

تذکرۂ شعرائے موسوم بہ عمدۂ منتخبہ از اعظم الدولہ میر محمد خاں سرور، غالب کی ابتدائی شاعری کا عہد متعین کرنے کے لیے اہم ترین ماخذ ہے خصوصاً نسخۂ مملوکہ قومی عجائب گھر، کراچی۔ اس کا زمانۂ تصنیف ۱۲۱۵ھ، (۱۸۰۰-۱ء) تا ۱۲۴۷ھ، (۳۲-۱۸۳۱ء) ہے جس میں متن کے علاوہ حاشیوں پر اضافے بھی شامل ہیں۔ متن میں غالب کا ترجمہ اسد کے تحت ہے اور وہ یہ ہے:

اسد تخلص، میرزا نوشہ۔ اصلش از سمرقند، مولدش مستقر الخلافہ اکبر آباد۔ جوانِ قابل یار باش۔ ہمیشہ بہ خوش معاشی بسر بردہ۔ ذوقِ ریختہ گوئی درخاطر متمکن۔ اکثر اشعارش در زمینِ سنگلاخ بہ مضامین موزوں گشتہ۔ رویۂ خیال بندی بیش از بیش پیشِ نہادِ خاطر دارد، از نتائجِ طبعِ اوست

---

[1] تفصیل کے لیے دیکھیے جائزہ مخطوطاتِ اُردو۔ جلد اوّل، ص ۱۰۴۵ تا ۱۰۵۸ از مشفق خواجہ مطبوعہ فروری ۱۹۷۹ء مرکزی اُردو بورڈ لاہور